اقبال اور وحدت الوجود

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

مقالہ پیش کرنے سے قبل پروفیسر موصوف نے حسب ذیل خیالات کا اظہار فرمایا:

حضرات! میں اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے ایک ایسی ضروری بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جسے میں مسلمانانِ پاکستان کی ملی اور قومی زندگی کے لئے حیات اور موت کا مسئلہ سمجھتا ہوں، جس پر عمل کرنے سے یہ ملک بھی قائم رہ سکتا ہے اور مسلمان بھی دنیا میں دوبارہ سربلند ہو سکتے ہیں۔

۱) حضرات! مذہب بالعموم اور دین اسلام بالخصوص اپنی ظاہری حیثیت کے لحاظ سے تو احکامِ شرع پر عمل کرنے کا نام ہے، لیکن اپنی باطنی حیثیت یا اپنی ماہیت کے اعتبار سے وہ زندہ خدا کے ساتھ ایک زندہ رابطہ پیدا کرنے کا نام ہے۔

زندہ خدا سے میری مراد وہ خدا ہے جو ہماری پکار کا جواب دے، اور زندہ رابطہ سے میری مراد یہ ہے کہ اس رابطے کی بدولت ہماری باطنی زندگی میں ایک عمیق انقلاب پیدا ہو جائے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں نوید جاوید عطا کی ہے کہ:

﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾

اسی لئے اقبال نے یہ خوشخبری سنائی ہے:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

۲) تو یہ رابطہ پیدا کیسے ہو؟ اس کا جواب اقبال سے سنئے!

مقامِ شوق جز صدق و یقیں نیست — یقیں جز صحبت روح الامیں نیست
گر از صدق و یقیں داری نصیبے — قدم بیباک نہ، کس در کمیں نیست

یہاں صحبت روح الامیں سے قرآن مراد ہے، یعنی تدبر فی القرآن۔

۳) معلوم ہوا کہ اگر ہم اللہ سے رابطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ہماری کوشش سے living contact یعنی رابطہ فعال بن سکتا ہے تو ہمیں قرآن کو اپنی زندگی کا محور بنانا ہوگا اور اس کے ساتھ living contact قائم کرنا ہوگا۔ میں افسوس سے کہتا ہوں کہ میں نے بچپن سے لے کر ۱۹۷۰ء تک ہند میں کوئی تحریک نہیں دیکھی جو قرآن سے رابطہ کے لئے چلائی گئی ہو۔

۱۹۲۲ء میں میرے استاد مولانا آزاد سبحانی مرحوم نے پریڈ گراؤنڈ کانپور میں ایک تاریخی تقریر کی تھی۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ شدھی کی تحریک کا مؤثر مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو قرآن پاک سے living contact پیدا کرنا چاہئے اور علماء قرآن کو درسِ نظامی میں داخل کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ علماء نے ابھی تک پورے قرآن کو نصاب میں داخل نہیں کیا۔ بطورِ تبرک دورۂ حدیث کے بعد اڑھائی پارے بیضاوی کی مدد سے بعجلتِ تمام پڑھا دیئے جاتے ہیں۔ یعنی قرآن عوام تو کیا خواص کی زندگی میں بھی داخل نہیں ہے:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی!

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے عاشق رسول دیکھے، بہت سے عاشق حدیث، بہت سے عاشق فقہ اور بہت سے عاشق ادبِ عربی دیکھے، مگر ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک کسی عاشق قرآن کو نہیں دیکھا تھا۔ الحمدللہ کہ زندگی کے آخری دَور میں ایک عاشق قرآن کو دیکھ لیا۔ میری مراد ڈاکٹر اسرار احمد سلمہ ربہ سے ہے۔

حکیم اسپنوزا کو زندگی میں تو یورپ نے کافر اور ملحد قرار دیا مگر مرنے کے بعد یورپ نے اسے ''God-intoxicated'' کا لقب دیا۔ میں نے اسپنوزا کو نہیں دیکھا مگر اسرار احمد کو دیکھا ہے، وہ میری رائے میں ''Quran-intoxicated'' مسلمان ہیں، جس کا ثبوت یہ ''انجمن خدام القرآن'' ہے۔

میں ڈاکٹر صاحب کی اس بات کو اپنی دلی تائید کے ساتھ اس وقت آپ کے گوش

گزار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ حضرات انجمن کے نصب العین اور طریق کار سے مطمئن ہیں تو انجمن کے ساتھ تعاون کیجئے۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى۔ اور اگر اختلاف ہے تو آپ خود ایک انجمن بنائیے اور لوگوں کو قرآن کی طرف بلائیے۔ ڈاکٹر صاحب کا مقصدِ حیات دعوت الی القرآن ہے نہ کہ حصولِ دولت وشہرت و وجاہت و تمکنت فی الارض۔ وہ تاجر نہیں ہیں' پروانۂ قرآن ہیں' اس لئے وہ کسی کے رقیب نہیں ہیں۔ رقابت تو تاجروں میں ہوتی ہے' پروانوں میں نہ ہوئی ہے نہ ہوسکتی ہے ع

محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد!

ڈاکٹر صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ساری قوم قرآن پر عاشق ہو جائے۔ قرآن نقش حق ہے' دیدارِ حق ہے' اور وہ اس نقش اور دیدارِ حق کو دیدارِ عام بنانا چاہتے ہیں۔ اس کی صورت اقبال نے یہ بتائی ہے:۔

نقش حق اوّل بجاں انداختن　　بعد او را در جہاں انداختن
نقش حق چوں در جہاں گردد تمام　　می شود دیدارِ حق دیدارِ عام!

لہٰذا میں سامعین کو عاجزانہ طور پر مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ وہ قرآن کو اپنی زندگی میں داخل کریں۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کی زندگی میں وہی انقلاب پیدا ہو جائے گا جو عربوں کی زندگی میں پیدا ہو گیا تھا۔ ہم بدل گئے ہیں مگر قرآن تو وہی ہے۔ اللہ بلاشبہ جہاں تھا وہیں ہے۔ مسلم سے یہ پوچھو وہ وہیں ہے کہ جہاں تھا؟

صد جہاں باقی ست در قرآں ہنوز　　اندر آیاتش یکے خود را بسوز

پس ضرورت تدبر فی القرآن ہے اور انجمن خدام القرآن کا واحد مقصد اسی حقیقتِ کبریٰ کو مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں کرنا ہے۔ فللّٰہ الحمد اولاً و آخراً

اب میں اپنا مقالہ پیش کرتا ہوں۔ اس مقالے کا مقصد اُس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہے جو اقبال کے اکثر عقیدت مندوں کے دماغ میں جاگزیں ہو گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اقبال وحدۃ الوجود کے خلاف تھے۔ یہ غلط فہمی بلاوجہ نہیں ہے' اس کے دو سبب ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ یہ حضرات وحدۃ الوجود اور حلول میں فرق نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ وحدۃ الوجود (Unity of Existence or Monism) کو حلول (Pantheism) کا مترادف سمجھ لیتے ہیں، یعنی وہ وحدۃ الوجود کا ترجمہ Pantheism کرتے ہیں یا Pantheism کو وحدۃ الوجود کا مترادف سمجھتے ہیں۔ اور جب وہ کسی انگریزی لغت میں Pantheism کا مفہوم تلاش کرتے ہیں تو وہاں انہیں یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ Pantheism حلول کو کہتے ہیں۔ اب حلول کا مطلب یہ ہے کہ خدا اس کائنات میں حل ہو گیا، اس لئے اس کا کوئی مستقل وجود باقی نہیں رہا۔

چونکہ یہ عقیدہ سراسر غیر اسلامی اور خلافِ قرآن ہے اس لئے یہ لوگ ایمان داری سے وحدۃ الوجود کو خلافِ اسلام قرار دے کر اس سے بیزاری کا اعلان کر دیتے ہیں اور اقبال کو اس کا مخالف قرار دے دیتے ہیں۔ اس ساری غلط فہمی کا مبنیٰ صرف یہ ہے کہ یہ لوگ وحدۃ الوجود کو Pantheism کا مترادف سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ دونوں میں وہی فرق ہے جو زمین اور آسمان میں ہے۔ ''All in God and God in All'' میں ساری کائنات خدا بن جاتی ہے مگر خدا کا ذاتی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس کی ساری ہستی کائنات میں حل ہو جاتی ہے۔ جس طرح پانی کے گلاس میں شکر ڈال دو سارا پانی شکر بن جائے گا مگر شکر کا کوئی ذاتی یا مستقل وجود باقی نہیں رہے گا۔

اس کے مقابلے میں وحدۃ الوجود (Unity of Existence or Monism) میں کائنات کا وجود غیر حقیقی یا ظلی یا وہمی ہے، صرف خدا کا وجود حقیقی اور اصلی ہے، اور جسے ہم کائنات کہتے ہیں یہ کچھ نہیں ہے مگر جلوۂ ذاتِ باری ہے۔

ضمناً چند مصطلحات مع مترادفات ذیل میں لکھے دیتا ہوں، جن میں نازک فرق ہے اور عموماً لکھے پڑھے آدمی بھی اس فرق کو نہیں سمجھتے۔

۱) Pantheism، اس کا مترادف حلول ہے۔

۲) Incorporation، اس کا مترادف تجسم یا تجسد ہے۔

۳) Fusion 'اس کا مترادف امتزاج ہے۔

۴) Union 'اس کا مترادف اتحاد ہے۔

۵) Incarnation 'اس کا مترادف انضمام ہے۔

۶) Unity of Existence 'اس کا مترادف وحدۃ الوجود ہے۔

۷) Unity of Appearance 'اس کا مترادف وحدۃ الشہود ہے۔

خلاصہ کلام ایں کہ Pantheism یعنی حلول کا عقیدہ تو بلاشبہ سراسر غیر قرآنی اور غیر اسلامی ہے۔

غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اسرارِ خودی کے دیباچے میں جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا اور جسے اقبال نے دوسرے ایڈیشن میں خود ہی حذف کر دیا تھا' انہوں نے شیخ اکبرؒ سے اختلاف کیا اور ایک خط میں یہاں تک لکھ دیا کہ:

''جہاں تک میں سمجھا ہوں (شیخ اکبر) ابن عربی کی فصوص الحکم میں الحاد اور زندقہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے''۔

اقبال کے جو عقیدت مند بذاتِ خود وحدۃ الوجود کے خلاف ہیں ان کے لئے اقبال کا یہ جملہ قولِ فیصل بھی ہے اور سند بھی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ۱۹۲۲ء سے تادمِ وفات وہی اقبال دوبارہ وحدۃ الوجود کی تعلیم دیتے رہے؟ لہٰذا ہر غیر جانب دار مبصر اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ شروع سے ۱۹۱۳ء تک اقبال نے وحدۃ الوجود کی تعلیم دی' ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک انہوں نے اس کی مخالفت کی' لیکن ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۸ء تک تادمِ وفات انہوں نے دوبارہ وحدۃ الوجود کی تعلیم دی۔

اگر کسی کو یہ شبہ لاحق ہو کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اقبال نے اپنی رائے تبدیل کر دی تو اس کا جواب میں وہی دوں گا جو خود اقبال نے مجھے دیا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ۱۹۳۵ء میں اقبال نے مرزا غلام احمد اور ان کے مسلک کے خلاف ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے ایک زبردست مخالفانہ مضمون لکھا تو احمدیوں نے اس کے جواب میں اقبال پر یہ اعتراض کیا کہ اقبال تو برسوں احمدیت کے مدّا

چکے ہیں۔ جب احمدیوں کا یہ مضمون اقبال نے پڑھوا کر سنا (کیونکہ وہ خود مطالعہ نہیں کر سکتے تھے) تو مجھے جواب لکھنے کی ہدایت کی اور اپنی مدافعت میں جو نکات لکھائے ان میں ایک نکتہ یہ لکھایا کہ بے شک شروع میں مجھے اس تحریک سے حسن ظن تھا' لیکن اب اس کا مسلمانوں کے لئے مضر ہونا مجھ پر واضح ہو گیا ہے اس لئے اب میں اس کی مخالفت کر رہا ہوں۔ اب رہا خیالات میں تبدیلی پر اعتراض تو اس کا جواب یہ ہے کہ:

Only stones do not change.

یہ فقرہ اقبال کا ہے جو مجھے اب تک حفظ یاد ہے کہ صرف پتھر تبدیل نہیں ہوا کرتا' انسان کے خیالات بدلتے رہتے ہیں۔

اسی طرح اقبال نے چند سال وحدۃ الوجود کی مخالفت کی لیکن پھر اُس مخالفت کو ترک کر دیا۔

اقبال نے ۰۴-۱۹۰۳ء میں عبدالکریم الجیلی پر جو مضمون لکھا تھا اس میں انہوں نے یہ فقرہ بھی لکھا تھا:

It will appear at once how greatly the author has emphasized the doctrine of the Logas, a doctrine which has always found favour with almost all the profound thinkers of Islam and in recent times by Mirza Ghulam Ahmad Qadiani, probably the profoundest theologian among modern Indian Mohammadans. (Thought and Reflections of Iqbal).

یہاں اقبال نے اسی مرزا کو ہندی مسلمانوں میں سب سے بڑا عالمِ الٰہیاتِ اسلامی قرار دیا ہے جسے ۱۹۳۵ء میں انہوں نے دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا۔ اسی طرح جس شیخ اکبر (امام ابن عربیؒ) کو انہوں نے ۱۹۱۶ء میں ملحد اور زندیق قرار دیا تھا اسی ''ملحد اور زندیق'' کا ذکر انہوں نے ۱۹۳۳ء میں بایں الفاظ کیا ہے:

"But what if the position, as understood by him (viz rant) is reversed? The Great Muslim Sufi Philosopher Muhyyuddin Ibn-ul-Arabi of Spain has made the acute observation that God is a percept, the world is a

concept." (Reconstruction of Religious Thouht, published by O.U.P,1934- p.172-73)

اس جگہ سامعین وقارئین کی آگاہی کے لئے یہ بتادوں کہ شیخ اکبرؒ کا لقب ''ابن العربی'' نہیں ہے (یہ ایک اور بزرگ ہیں جنہوں نے تفسیر احکام القرآن چار جلدوں میں لکھی ہے۔ان کا پورا نام ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی ہے) بلکہ ''ابنِ عربی'' ہے۔

اسی طرح ۱۹۱۶ء میں انہوں نے شیخ اکبر کی فصوص الحکم کو ''الحاد اور زندقہ'' سے تعبیر کیا تھا' لیکن ۱۹۰۷ء میں انہوں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے

Development of Metaphysics in Persia

میں انہی شیخ اکبر کا ذکر بایں الفاظ کیا تھا:

The student of Islamic Mysticism who is anxious to see an all embracing exposition of the Principle of Unity must look up the heavy volumes of the Andulusian Ibn-al-Arabi whose profound teaching stands in strange contrast with the Dry-as-dust Islam of his country men.

واضح ہو کہ اس جملے میں Principle of Unity سے ''وحدت الوجود'' مراد ہے اور بقول اقبال ''شیخ اکبر اسی وحدۃ الوجود کے انتھک مفسر تھے''۔

(دیباچہ اسرارِ خودی' ۱۹۱۵ء)

اگرچہ میں نے اپنا مدّعا بھی واضح کر دیا ہے اور دعویٰ بھی ثابت کر دیا ہے کہ:

۱) ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۲ء تک انہوں نے وحدۃ الوجود کی تعلیم دی۔

۲) ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۷ء تک انہوں نے اس نظریے کی مخالفت کی۔

۳) ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۸ء تک (تادمِ وفات) انہوں نے دوبارہ وحدۃ الوجود کی تعلیم دی۔

لیکن میں اپنی تائید کے لئے دو شواہد مزید پیش کرنا چاہتا ہوں۔

شاہد اوّل: جناب عباداللہ فاروقی اپنے مقالے (اقبال ریویو بابت جنوری ۱۹۷۴ء' ص ۵۹) میں لکھتے ہیں:

''اقبال نے ۱۹۱۰ء کے بعد نظریہ وحدۃ الوجود کی بھرپور مخالفت شروع کر دی تھی' لیکن ۱۹۲۲ء کے بعد وہ پھر اسی نظریئے کے حامی نظر آتے ہیں' لیکن ان کا یہ اظہار فلسفے کی حدود کے اندر رہا۔ مذہبی اعتبار سے وہ توحید ہی کے علمبردار رہے۔ فلسفے کی حدود کے اندر اُن کے اور شیخ اکبرؒ کے وجودی تصورات میں خاصی ہم آہنگی اور مماثلت نظر آتی ہے۔ مثلاً شیخ اکبرؒ کے نزدیک وجود' فردِ واحد ہی میں منحصر ہے' یعنی اس زمین سے آسمان تک بجز ذاتِ حق اور کوئی شے موجود نہیں ہے۔ یعنی کائنات معدوم ہے لیکن اللہ کی تجلّیٔ صفات پڑنے سے موجود ہو گئی ہے۔ ذاتِ باری کی جملہ صفات عینِ ذات ہیں۔ اگر ذات و صفات میں عینیت نہ ہوتی تو دوئی لازم آ جاتی جو محال ہے۔ واضح ہو کہ ابن عربی کائنات کو تجلّیٔ صفات یا ظہورِ ذات کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کائنات اپنے ظہور میں عین ذاتِ باری ہے اور علامہ بھی انہی نظریات کے علمبردار اور ترجمان ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی؟

۱۹۱۶ء میں' جیسا کہ گزر چکا ہے' علامہ نے واضح طور پر بتایا تھا کہ مسئلہ وحدۃ الوجود ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ۱۹۳۰ء میں وہ اپنے خطبۂ صدارت الٰہ آباد میں اس نظریۂ وحدۃ الوجود کو مذہبی نقطۂ نظر سے بھی حق قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ''مذہب اسلام کی رو سے خدا' کائنات' کلیسا' ریاست' مادہ اور روح ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں۔''

فاروقی صاحب کی یہ حیرت بالکل بجا ہے' کیونکہ ۱۹۳۰ء میں وہی شخص اس وحدۃ الوجود کی تلقین کر رہا ہے جو ۱۹۱۶ء میں اسے الحاد اور زندقہ کا مترادف قرار دے چکا تھا۔ مگر اقبال کا یہ جملہ اس حیرت کو زائل کر سکتا ہے کہ:

Only stones do not change.

مجھے اس سے بحث نہیں کہ اقبال نے اپنے سابقہ عقیدے سے کیوں رجوع کیا۔ اگر اقبال اس وقت زندہ ہوتے تو میں خود اُن سے دریافت کرتا۔ وہی اس کا صحیح جواب

دے سکتے تھے۔ مجھے قیاس آرائی کی کوئی حاجت نہیں۔ میرے لئے یہ بات کافی ہے کہ انہوں نے چند سال کے بعد وحدۃ الوجود کی مخالفت ترک کر دی تھی اور تادمِ وفات وہ وحدۃ الوجود کی تعلیم دیتے رہے۔

شاھد ثانی: پروفیسر علی عباس جلال پوری نے اپنی تصنیف ''اقبال کا علم کلام'' میں ''اقبال اور نظریۂ وحدۃ الوجود'' پر ایک مستقل باب باندھا ہے جو اِس کتاب کے صفحہ ۷۸ سے لے کر ۱۱۲ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ پورا باب بڑی تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے اور بغور مطالعے کے لائق ہے۔ میں یہ پورا باب لفظ بلفظ تو نقل نہیں کر سکتا' چند اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

''اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بقول پروفیسر میاں محمد شریف صاحب اقبال صرف نوفلاطونی ہی نہ تھے بلکہ وحدۃ الوجود پر کاملاً یقین رکھتے تھے''۔ (صفحہ ۸۴)

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
ہاں آشنائے لب نہ ہو راز کہن کہیں — پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں

ان اشعار میں اقبال وحدتِ وجود کی پرجوش ترجمانی کرتے ہیں۔

''جب سوامی رام تیرتھ نے ۱۹۰۶ء میں دریائے گنگا میں ڈوب کر خودکشی کر لی تو اقبال نے انہی کے نام سے ایک نظم لکھی تھی جس میں فنا فی اللہ کا وجود اور ویدانتی تصور پیش کیا تھا''۔

''اقبال اُس دور میں وحدت وجود کے قائل تھے اس لئے ابن عربیؒ اور رومیؒ کی طرح خدمت خلق اور ہمدردیٔ انسانی کو حسنِ اخلاق کا جوہر سمجھتے تھے۔ ''نیا شوالہ'' کا ایک شعر جسے اقبال نے بعد میں حذف کر دیا تھا' قابل غور ہے:

اگنی ہے وہ جو نرگن' کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے بیکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

یہ نظم انہوں نے غالباً ۱۹۰۴-۵ء میں کہی تھی''۔

''بہرکیف یورپ کے دورانِ قیام میں بھی ایک مدت تک اقبال وحدۃ

الوجود کے قائل رہے۔ ان کے استاد میک ٹیگرٹ نے اقبال کو لکھا تھا کہ:
''ایامِ طالب علمی میں تو آپ وحدتِ وجود کے قائل تھے لیکن اب مخالفت کرنے لگے ہیں''۔

''مقام حیرت ہے کہ اقبال نے تمام وجودی صوفیہ اور فلاسفہ کی سخت مخالفت کی لیکن رومی کو' جو وحدت وجود کے ممتاز ترجمان سمجھے جاتے ہیں' نہ صرف مستثنیٰ قرار دیا بلکہ ان کو اپنا پیر و مرشد بھی تسلیم کرلیا''۔

''مولانا روم' مولانا صدر الدین قونوی (شارح شیخ اکبر) کے واسطے سے شیخ اکبر ابن عربی سے مستفید و متاثر ہوئے تھے اور تمام شارحین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ رومیؒ وحدتِ وجود کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس کے پُر جوش مبلغ بھی تھے۔ فلاطینوس اور ابن عربی کی طرح ان کی الٰہیات کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ارواحِ انسانی ماخذِ حقیقی سے صادر ہوئی ہیں اور اسی کی طرف بازگشت کے لئے جدوجہد کرنا سعیٔ انسانی کا مقصود ہے''۔

''سوال پیدا ہوگا کہ اقبال نے ابن عربی کی تعلیمات کو الحاد و زندقہ قرار دینے کے بعد اُن کے ایک متبع (رومی) کو اپنا پیر و مرشد کیوں منتخب کیا؟ اقبال کے بعض شارحین نے بھی اس دقت کو محسوس کیا ہے اور دو ایک نے حتی المقدور اس اشکال کو رفع کرنے کی کوشش بھی کی ہے' لیکن اس کوشش میں وہ مولانا روم کی وجودی الٰہیات سے مکمل طور پر قطع نظر کر لیتے ہیں''۔ (ص ۹۳)

''جیسا کہ ہم گزشتہ سطور میں ذکر کر چکے ہیں' اقبال اپنی شاعری کے پہلے دَور میں جو قیامِ یورپ کے اوائل تک محیط ہے' وحدتِ وجود کے شارح اور نوفلاطونی صوفی تھے۔ جب انہوں نے احیاء و تجدید ملت کا بیڑا اٹھایا تو وہ ہمہ اوست کی مخالفت کرنے لگے۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ اقبال مرتے دم تک وحدت وجود اور عقیدہ سریان کے مخالف رہے لیکن یہ سراسر عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال اواخر عمر میں وحدت وجود کی طرف دوبارہ رجوع کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ چنانچہ خطبات (Reconstruction) میں انہوں نے واشگاف انداز میں سریان کی حمایت کی ہے۔ اس لئے جہاں تک سریان کا تعلق ہے اقبال اور شیخ اکبرؒ کی الٰہیات میں کسی قسم کا فرق نہیں

ہے''۔ (ص۱۰۰)

''خطبات سے اس امر کا اور ثبوت مل سکتا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں اقبال دوبارہ وحدت وجود کی طرف مائل ہو گئے تھے اور حلاّج اور ابن عربی کی تعلیمات کو بنظر استحسان دیکھنے لگے تھے۔ ایک زمانے میں انہوں نے ابن عربی کی تعلیمات کو کفر اور زندقہ قرار دیا تھا لیکن جب خطباتِ مدراس لکھتے وقت آئنس ٹائن کے نظریۂ اضافیت کے اسلامی ماخذ کی تلاش جاری تھی تو سید سلیمان ندوی کو لکھا ''کیا یہ خیال (کہ دہر اللہ ہی ہے) محی الدین ابن عربیؒ کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے؟'' (ص۱۰۲)

''خطبات میں فرماتے ہیں: ''چنانچہ اسلامی اندلس کے مشہور صوفی فلسفی ابن عربی کا یہ قول کیا خوب ہے کہ وجودِ مدرک تو خدا ہے' کائنات تو معنی و مفہوم ہے.....''

''ان سطور میں انہوں نے کھلے انداز میں ابن عربی کے نظریہ وحدتِ وجود کو درست تسلیم کر لیا ہے۔ عراقی' شیخ اکبر کا شاگرد اور مشہور وجودی شاعر تھا اور اقبال نے خطبات میں متعدد مقامات پر عراقی سے استشہاد کیا ہے۔ اسی طرح شیخ مقبول اور بایزید بسطامی سے صوفیۂ وجودیہ کی تعلیمات سے استدلال کیا ہے..... اقبال نے بایزید بسطامیؒ کے قول سے وحدت وجود کا اثبات کیا ہے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے جاوید نامے میں حلاّج کا هُوَ هُوَ اور ابن عربی کے حقیقة الحقائق کا تصور ''عبدہ'' کے نام سے پیش کیا''۔ (ص۱۰۳)

''اقبال نے ابن عربی کا حقیقتِ محمدیہ کا یہ تصور من وعن عبدہ کے نام سے جاوید نامے میں پیش کیا ہے۔

عبدۂ چند و چگونِ کائنات
عبدۂ رازِ درونِ کائنات!

کس ز سر عبدۂ آگاہ نیست — عبدہ جز سر الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدۂ — فاش تر خواہی؟ بگو ہو عبدۂ
مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت — تا نہ بینی از مقامِ مَـارَمَیْـت

''اقبال نے لوگاس(Logas) کا نظریہ ابن عربی اور منصور حلاج سے اخذ کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ اب وہ کھلم کھلا منصور سے استفادے کی دعوت دینے لگے۔ (یہ وہی منصور ہے جسے وہ کسی زمانے میں سزاوارِ قتل یقین کرتے تھے۔)

چنانچہ ارمغانِ حجاز میں لکھتے ہیں:

بجامِ نو کہن مے از سبو ریز فروغِ خویش را بر کاخ و کو ریز
اگر خواہی ثمر از شاخِ منصور بدل لا غالب الا اللہ فرو ریز!

''کسی زمانے میں اقبال صوفیہ کی الٰہیات کو الحاد سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں: تصوف کے ادبیات میں فلسفے کا حصہ محض بیکار ہے اور بعض صورتوں میں تعلیم قرآن کے مخالف ہے۔ (ص ۱۱۰) لیکن جب الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید کے لئے قلم اٹھایا تو وہ صوفیۂ وجودیہ کی الٰہیات سے استفادے پر مجبور ہو گئے۔ اور ابن عربی، عراقی، منصور حلاج، شیخ مقتول اور یزید بسطامیؒ جیسے مشاہیر صوفیہ وجودیہ سے بلا تکلف استفادہ کرنے لگے۔

ان حقائق وشواہد سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ اقبال کے فکر ونظر کا آغاز بھی وحدت الوجود اور سریان سے ہوا تھا اور انجام بھی وحدۃ الوجود اور سریان ہی پر ہوا''۔ (ص ۱۱۰، ۱۱۱ کتابِ مذکور)

خلاصۂ کلام ایں کہ:

اقبال نے ۱۸۹۸ء سے ۱۳۔۱۹۱۲ء تک وحدۃ الوجود کی تعلیم دی، ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۷ء تک انہوں نے اس عقیدے سے اختلاف کیا، ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۸ تک انہوں نے پھر اس عقیدے کی تعلیم دی۔ ذیل میں ان کی تصانیف سے شواہد پیش کرتا ہوں:

۱) رموزِ بےخودی (۱۸۔۱۹۱۷ء) میں لکھتے ہیں:

برسر ایں باطلِ حق پیرہن تیغِ لا موجود الّا ہو بزن

۲) پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء) میں لکھتے ہیں:

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی، جز خود نہ بینی تلاشِ خود کنی جز او نیابی

اس رباعی میں اقبال نے وحدۃ الوجود کی تعلیم اس شد و مد سے دی ہے کہ وحدۃ الوجود کا بڑے سے بڑا مخالف بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس رباعی میں اقبال نے بلاشک وشبہ وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ جب میں نے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم، سابق سفیر مصر سے ۱۹۵۳ء میں یہ دریافت کیا کہ آپ نے ''پیامِ مشرق'' کے عربی ترجمے میں اقبال کی اس اہم رباعی (مذکورہ بالا) کا عربی میں ترجمہ کیوں نہیں کیا؟ تو انہوں نے صاف لفظوں میں یہ جواب دیا کہ:

''میں وحدۃ الوجود کا مخالف ہوں۔ اقبال نے اس رباعی میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے اس لئے میں نے عمداً اس کا ترجمہ نہیں کیا''۔

میرا جی تو چاہتا تھا میں ان سے کہوں: مگر یہ بات ایک مترجم کے شایانِ شان تو نہیں کہ وہ اس بات کو حذف کر دے جو اُس کے ذاتی عقیدے کے خلاف ہو، یہ تو ایک قسم کی بددیانتی ہے۔ مگر میں مصلحتاً خاموش ہو گیا۔

۳) زبورِ عجم (مطبوعہ ۱۹۲۷ء) میں لکھتے ہیں:

بضمیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی　　بکنارہ برفگندی دُرِ آبدارِ خود را
مہ و انجم از تو دارد گلہ ہا شنیدہ باشی　　کہ بخاکِ تیرۂ ما زدہ؟ شرارِ خود را
نہ مارا در فراقِ او عیارے　　نہ او را بے وصال ما قرارے
نہ او بے مانہ ما بے او چہ حال ست　　فراقِ ما فراق اندر وصال ست
نہ من را می شناسم من نہ او را
ولے دانم کہ من اندر برِ او ست

۴) جاوید نامہ میں وحدۃ الوجود کی تعلیم بایں الفاظ دی ہے:

عبدۂ از فہم تو بالاتر ست　　زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر ست
عبدۂ صورت گر تقدیر ہا　　اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا
لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدۂ　　فاش تر خواہی؟ بگو ہو عبدۂ

۵) بال جبریل میں اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:

یہ ہے خلاصۂ علم قلندری کہ حیات خدنگ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں!
وہی اصل مکان و لا مکاں ہے مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے!
خضر کیونکر بتائے' کیا بتائے؟ اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے!

۶) مسافر میں اس نقش کو یوں ہویدا کیا ہے:

از ضمیر کائنات آگاہ اوست تیغ لا موجود الا اللہ اوست

۷) ضربِ کلیم میں اس راز کو بایں طور فاش کیا ہے:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُنّاری نہ ہے زماں نہ مکاں' لا الٰہ الا اللہ

۸) ارمغانِ حجاز میں وحدۃ الوجود پر کئی رباعیاں ہیں' میں صرف ایک رباعی درج کرتا ہوں:

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب بخود مثل نیاگاں راہ دریاب
چساں مؤمن کند پوشیدہ را فاش ز لا موجود الا اللہ در یاب

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز
زناخن سینہ کاویدن بیاموز!

اگر خواہی خدا را فاش بینی خودی را فاش تر دیدن بیاموز
اگر زیری ز خود گیری زہر شو خدا خواہی؟ بخود نزدیک تر شو!

پیامِ مشرق سے لے کر جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی' ارمغانِ حجاز تک جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی' اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں مسلسل وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے۔ میں نے بخوفِ طوالت صرف چند اشعار پیش کئے ہیں' طالبانِ حق بطورِ خود اقبال کا از اوّل تا آخر مطالعہ کر لیں' حقیقت واضح ہو جائے گی' یعنی وہ مجھ سے متفق ہو جائیں گے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں نے ان کی زندگی میں ان سے نہیں پوچھا کہ جناب! آپ نے چند سال کے لئے شیخ اکبرؒ سے اختلاف کیوں کیا تھا؟ بہر حال یہ دونوں باتیں مسلّم اور مبرہن ہیں کہ:

۱) انہوں نے چند سال تک ۱۴-۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۷ء عقیدۂ وحدۃ الوجود سے اختلاف کیا اور ۱۹۱۸ء سے تادمِ وفات دوبارہ اس کی تعلیم دی۔ اب رہی یہ بحث کہ قرآن حکیم اس عقیدے کا حامی یا مؤید ہے یا نہیں، تو اسے ہم کسی دوسری مجلس کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ یار زندہ صحبت باقی!

آخر میں صرف ایک اور اقتباس ان کے خطباتِ مدراس سے پیش کئے دیتا ہوں، تاکہ کسی کے دل میں یہ کھٹک باقی نہ رہے کہ اقبال نے اس مہتم بالشان مسئلے پر اپنی مایۂ ناز متکلمانہ تصنیف میں کس خیال کا اظہار کیا ہے۔ واضح ہو کہ اس کتاب میں بھی انہوں نے وحدۃ الوجود ہی کی تعلیم دی تھی۔ یہ خطبات انہوں نے ۱۹۲۹ء میں سپردِ قلم کئے تھے۔ 'reconstruction' کے صفحہ ۶۸ مطبوعہ آکسفورڈ پر لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''یعنی یہ کائنات سالماتِ مادّی کی غیر شعوری اور غیر اختیاری حرکت سے لے کر فکر انسانی کی بااختیار حرکت تک (یعنی یہ کائنات بحیثیت مجموعی) انائے کبیر یعنی حق تعالیٰ کی ذات کا ظہورِ خارجی ہے۔ یا عرفِ عام میں اس کی ذات کی تجلی یا اظہار ہے۔ میری رائے میں یہ اعتراف فیصلہ کن اور قطعی الدلالۃ ہے جس کے بعد مزید کسی ثبوت کی حاجت نہیں رہتی۔''

(بشکریہ ماہنامہ میثاق، نومبر دسمبر ۱۹۷۸ء)

نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے